© rasailojaraid.com

مہم برائے Strategic معلومات

برطانیہ کے فلسطین پر قبضے سے سیکھا گیا سبق (۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء)

تحریر: کیٹ اُٹنگ*
ترجمہ: پروفیسر اے-ڈی- میکن

معلومات اور بغاوت کا تدارک

جنگ اور بغاوت کو کچلنے کے اقدامات کی سیاسی اور نفسیاتی نوعیت کی روشنی میں، متعلقہ افراد کی زندگیوں کے حقائق سے متعلق معلومات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ بغاوت بھی دراصل سیاسی جواز کی کسی کمزوری یا ناکامی کی صورت میں ہی ابھرتی ہے۔ جو ایک لحاظ سے حکمران ٹولے اور محکوم لوگوں کے درمیان ایسے اختلافات پر مبنی ہوتی ہے جس میں حکمران سیاسی وسائل کے ساتھ ساتھ، تشدد کرتے ہوئے سیاسی مخالفت کے کچھ عناصر کو قائم ودائم رکھتے اور ان کے جواز کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح بغاوت یا اس کے خلاف طاقت کا استعمال دونوں عوام کا دل جیتنے کے عمل کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں اور اپنے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ان چار میدان ہائے عمل میں کوشاں ہوتے ہیں جن میں سیاسی، عسکری، معاشی اور نفسیاتی ذرائع شامل ہیں۔ باغیانہ خیالات رکھنے والے اور غیر مطمئن افراد کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد کی نشان دہی کر لی جائے اور انہیں اس خیال پر توجہ دینے پر مائل کر لیا جائے کہ باغیوں کی پشت پناہی سے اُنہیں جو کچھ میسر آ سکتا ہے، اس سے کہیں زیادہ انہیں

* یہ مضمون The Contemprary Security Policy, Vol. 28, No. 1, April 2007 میں Strategic Information Campaign: Lessons from the British Experience in Palestine 1945-1948 کے عنوان سے شائع ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومت سے تعاون کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے تو ایسی صورت میں لوگوں کے دل اور دماغ فتح کرنے کے عمل کو نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔ گویا معلومات حاصل کرنے کی مہم بغاوت کچلنے کی حکمتِ عملی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کرسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تنازعے کی نفسیاتی نوعیت کا ادراک کیا جائے، اور عمل کامیابی پر اس کو سمجھ کر ان سے نمٹنے کا اہتمام کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں برطانیہ کا بغاوت کے تدارک کا نظریہ چند پائیدار اصولوں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد پر دہشت گردی کے تدارک کی پیچیدگیوں کو سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلاف کارروائی کے لیے راہنما اصول اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ بنیادی اصول اس طرح سے ہیں: عوام کی اہمیت و اولیت، واضح سیاسی مقاصد، ایک متحدہ لائحہ عمل، جاسوسی پر ارتکاز اور باغیوں یا دہشت گردوں کو تنہا کرنا (یعنی ان پر لوگوں کے اعتماد کو کمزور کرنا)۔ اس آخری اصول، یعنی دہشت گردوں کو تنہا کرنے کے ضمن میں دلوں اور دماغوں پر قابو پانے والی معلوماتی مہم بے حد اہم کردار ادا کرسکتی ہے جس کے ذریعے دہشت گردوں کے عزائم کی مقبولِ عام توجیہات کو کمزور کیا جاسکتا ہے۔

دہشت گردی کے علاج کے لیے متحدہ قومی نقطۂ نظر اور لائحہ عمل اختیار کرنے کے لیے حکومت کے مختلف شعبوں میں ایک متفقہ اور مستعدانہ کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ برطانوی حکومت کے اثرات پر مبنی یا جامع طرزِ عمل کی ایک غیر محرکہ جہت ہے۔ کسی بغاوت کے خلاف نتائج پر مبنی طرزِ عمل اختیار کرنے کا مطلب آویزش کے حوالے سے وسیع البنیاد اور طویل المیعاد نقطۂ نظر قائم کرنا ہے۔ اصل توجہ نتائج پر ہے اور اس کے لیے عسکری اور غیر عسکری ذرائع کا متفقہ اور بیک وقت استعمال لازم ہے۔ یعنی اس کے لیے قومی قوت کے تمام ذرائع کو یکجا کرکے استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کامیابی کے لیے تزویراتی (strategic) ماحول کو سمجھنا لازم ہوتا ہے تاکہ مناسب ترین نتائج کو یقینی بنایا جاسکے۔ اور وسائل کو اس طرح استعمال کیا جاسکے کہ مطلوبہ نتائج پیدا کیے جاسکیں۔ یاد رہے کہ ان حالات میں نتائج حسبِ توقع بھی ہوسکتے ہیں اور خلافِ توقع بھی۔

اس جامع طرزِ عمل کے ایک جزو کی حیثیت سے انفارمیشن کے لیے درکار مہم حکومت کی ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی مرتکز کارروائی ہے جس سے دنیا بھر کے فیصلہ کاروں کو، اپنی قومی پالیسی کے حق میں اور اپنے فیصلہ سازوں کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ، متاثر کیا جا سکے۔ برطانیہ میں انفارمیشن کی مہم کو کیبنٹ آفس کی سطح پر اور خارجہ اور کامن ویلتھ کے دفاتر کے علاوہ تجارت، صنعت، بین الاقوامی ترقی کے شعبوں اور وزارتِ دفاع کے مابین مربوط گفت وشنید کے ذریعے منضبط کیا جاتا ہے۔ اس طرح انفارمیشن مہم کا اصل مقصد مجموعی حکمت عملی کو بامعنی بنانا ہے۔ اصل چیلنج تمام متعلقہ افراد اور گروہوں کو ایک مربوط اور جامع پیغام دینا ہے۔ اس لیے معلومات اور پروپیگنڈے کا مربوط ہونا لازمی ہے۔

خلافِ بغاوت انفارمیشن چیلنج

خلافِ بغاوت مہم کے حوالے سے انفارمیشن کے حصول کے عمل میں مخصوص قسم کے چیلنج موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا چیلنج یہ سمجھنے کے حوالے سے ہے کہ باغیوں کی نظر میں انفارمیشن کا مقصد اپنے مقصد اور بقاء کے حق میں تائید حاصل کرنا ہے۔ اس کے ساتھ حکومت کی نظر میں اس کے مقصد کو سمجھنا بھی ہے۔ باغیوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے خلاف ریاست کو متحرک کریں تاکہ حکومت ان کے خلاف موثر کارروائی میں ناکام رہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنے مقصد کو جائز اور حکومت کے نقطۂ نظر کو بلا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے حکومت کی انفارمیشن کے حصول کی مہم مستعد اور اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ متعلقہ آبادی (افراد) کی حمایت حاصل کی جا سکے۔ گویا حکومت کو باغیوں کے پراپیگنڈے اور انفارمیشن کے حصول کے سلسلے کو منقطع کرنے اور یوں انہیں متعلقہ افراد کو متاثر کرنے میں ناکام بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے افراد ملک کے اپنے شہری بھی ہوں گے اور غیر ملکی افراد، ادارے اور پاور گروپ بھی ہو سکتے ہیں۔ باغیوں کے پراپیگنڈے کے اثرات زائل کرنے کے لیے حکومت کو ان کے منفی اعمال وافعال کو روشنی میں لانا ہوتا ہے۔ مثلاً اس امر پر زور دینا چاہیے کہ دہشت گردانہ کارروائیاں (جن میں بے گناہوں کا خون بہتا ہے) جائز قرار نہیں دی جا سکتیں جبکہ اس کے برعکس خود اپنے اعمال، فیصلوں اور کارروائیوں یعنی خلافِ بغاوت مہم کو جواز فراہم کرنے کے لیے دلائل لانا ہوں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومت کی انفارمیشن سے متعلق کوششوں کے حوالے سے متعلقہ افراد کے بارے میں بہت احتیاط سے غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ ان میں سے کن کن لوگوں کی رائے خلاف بغاوت کارروائی کا جواز پیش کرسکتی ہے اور کون کون بغاوت کی کامیابی یا ناکامی میں عملاً کردار ادا کرسکتے ہیں۔ انفارمیشن کی مہم کے مندرجات اور ان کے مفاہیم، مربوط، سادہ، قابل یقین اور سچائی پر مبنی ہوں۔ ایسی ''سچائی'' جسے عام متعلقہ افراد کے ذہنوں میں اتارا جاسکے، انفارمیشن (حاصل کرنے اور پھیلانے) کی کوششوں کی کامیابی کے لیے وسیع تر سیاسی اور سفارتی عمل کی ضرورت پڑے گی، جس کے ذریعے حکومت کی قابل بھروسہ ہونے کی حیثیت اور عمومی مقبولیت کو قانونی اختیار کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور حکومت باغیوں کو مجرم ذہن کی حامل اقلیت ثابت کرسکے گی اور وسیع تر عالمی رائے عامہ کو قائل کرسکے گی کہ حکومت کے اقدامات اور سیاسی مقاصد جائز ہیں اور یہ کہ اس کی مخالفِ بغاوت مہم قانوناً اور اخلاقی اعتبار سے جائز ہے اور یہ کہ اس کا اصل مقصد ایسے سیاسی حل کو مقبول بنانا ہے جو وسیع النظر اور ترقی پسند اکثریت کے حق میں ہے۔

یہ ایک آئیڈیل صورتِ حال ہے مگر یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ پراپیگنڈے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اسے نہ پالیسی سے الگ کرکے دیکھنا چاہیے نہ اس کے متبادل کے طور پر سمجھنا درست ہے۔ اکثر لوگوں نے پالیسی سے غلط مفہوم لے لیا، یا یہ ناقابل یقین اور ناقابل فہم قرار پائی یا اسے ناجائز قرار دے دیا گیا، تو محض پراپیگنڈہ یا انفارمیشن کی حکمت عملی کے زور پر خلافِ بغاوت مہم کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

فلسطین میں ناکامی

برطانیہ کی فلسطین میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء کے دوران چلنے والی مہم اس مضمون میں کیس سٹڈی کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ برطانیہ کی فلسطین پر تسلط قائم رکھنے میں ناکامی اور بالآخر انخلاء کا سبب وہاں پر کارفرما دہشت گردانہ مہم تھی جو فلسطینی مجاہدین چلا رہے تھے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس صورت حال کو متعلقہ بحث میں کیس سٹڈی قرار دیا ہے اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیکیورٹی فورسز کے لیے سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکمت عملی کی سطح پر اثر انداز ہونے والی مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو بالآخر ان فورسز کی ناکامی پر منتج ہوتی ہیں۔ بعض لوگ اس ناکامی کی وجہ اس صورت حال کو قرار دیتے ہیں کہ سیکیورٹی فورسز اور مقامی انتظامیہ کو پابند کر دیا گیا تھا کہ جب تک مسئلے کا کوئی سفارتی حل دریافت نہیں کر لیا جاتا وہ محض امن کے قیام تک محدود رہیں (اور باغیوں کے خلاف سخت کارروائیوں سے اجتناب کریں) تھامس موکیٹس نے اس ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے خیال میں برطانیہ نے کم طاقت کے استعمال کی صحیح چال استعمال کی تھی کیونکہ وہ دہشت گردوں کے خلاف عسکری اور سول انتظامیہ کے تعاون کو لازمی قرار دینے میں حق بجانب تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے اقدامات پالیسی کے متبادل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس ساری تصویر میں اس امر پر بہت کم روشنی پڑتی ہے کہ خلافِ بغاوت مہم کی کامیابی کے لیے کس نوعیت کی پالیسی اختیار کی جائے۔

مختلف چالوں کے تجزیے سے ناکامیوں کی نشان دہی ہو جاتی ہے مثلاً جاسوسی پر مبنی معلومات اور برطانوی پولیس کی مخصوص کارروائیوں نے فلسطین کی بغاوت کی حقیقت کو سمجھنے میں معاونت نہیں کی۔ چنانچہ دہشت گردانہ مہم نے برطانیہ کو مکمل شکست سے دوچار کر کے بالآخر اسے انخلا پر مجبور کر دیا۔ اسی اعتبار سے اس ناکامی کو پروپیگنڈے کی ناکامی بھی سمجھنا چاہیے۔ آئین بیکٹ نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''باغیوں کی پروپیگنڈہ مشین بہت موثر رہی جبکہ برطانیہ کا موقف دفاعی انداز کا حامل رہا۔ اس میں شدت نہ تھی اور نتیجتاً اس میں کوئی طے شدہ پروگرام کارفرما نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس نے باغیوں کی اپیل کے ایک موثر متبادل کا کام کیا''۔

ڈیوڈ چارٹر نے اور بھی شدید تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ جہاں تک برطانوی پراپیگنڈے کے خلاف باغیوں کے پروپیگنڈے کی کامیابی کا سوال ہے، باغیوں کا پراپیگنڈہ چڑھائی کرنے کے انداز میں تھا جبکہ برطانوی پروپیگنڈہ دفاعی رہا۔ باغیوں کا پروپیگنڈہ قابل فہم تھا جبکہ برطانوی پراپیگنڈہ غیر مربوط اور غیر مسلسل رہا۔ باغیوں نے پروپیگنڈے کے اثرات سے فائدہ اٹھانے میں پھرتی دکھائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جبکہ برطانوی اس حوالے سے سُست ثابت ہوئے۔

فلسطین اور برطانیہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک کے عرصے سے متعلق تزویراتی معلومات کے حصول کی مہمات کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ برطانیہ معلومات کی بنیاد پر فلسطین کی جنگ ہارا مگر اس کے باوجود پالیسی کے پبلسٹی پہلوؤں کی اہمیت وافادیت سے برطانوی حکومت کی آگاہی میں شک نہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ برطانیہ فلسطینی قوم پرستی اور یہودی قوم پرستی کی کیفیات کا خود اپنے افراد کی قوم پرستی سے تقابل کرتا رہا جو عملاً درست رویہ نہ تھا۔ اس مسئلے کی جڑیں پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کی اتحادی پالیسی میں ہیں اس کے نتیجے میں یہودیوں کے اس دعوے کو تقویت ملی کہ فلسطین تو ان کے لیے ارضِ موعودہ ہے۔

بغاوت کا پس منظر

لیگ آف نیشنز کے فیصلے کے مطابق پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد فلسطین برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا اور اس وقت تک رہا جب تک کہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ کو یہاں سے بھاگنا نہیں پڑا۔ لیگ آف نیشنز کے عطا کردہ اختیار کی روشنی میں برطانیہ قانوناً اس امر کا پابند تھا کہ خطے میں ایسا سیاسی، انتظامی اور معاشرتی ماحول پیدا کرے کہ یہاں یہودیوں کے لیے ایک وطن (ہوم لینڈ) قائم کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ وہاں ایسے خود اختیار ادارے استوار ہوسکیں جن کی مدد سے فلسطینی، بلاتمیز رنگ ونسل اور مذہب، معاشرتی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کے ساتھ رہ سکیں۔ جنگ کے عرصے کے دوران برطانیہ نے ایسے ادارے قائم کرنے کی کافی کوشش کی کہ یہودی اور مسلمان اس حقیقت کے باوجود پرامن طور پر ساتھ ساتھ رہ سکیں کہ وہ دونوں گروپ اس پر یقین رکھتے تھے کہ اللہ نے ان سے فلسطین کی حکومت عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تاہم ہٹلر کے اقتدار نے صورت حال کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور پورے یورپ سے یہودی فلسطین کی طرف نقل مکانی کرنے لگے اور یوں انہیں ایک گھر میسر آ گیا جس کے نتیجے میں ان کی توقعات اور بھی زیادہ شدید ہوگئیں۔

جب یہودیوں نے اس نوساختہ ریاست پر مکمل طور پر قبضہ جمالیا تو ۱۹۳۶ء میں فلسطینی عربوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بغاوت کر دی۔ اس کے نتیجے میں لیگ آف نیشنز کے تحت پیل کمیشن نے فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر یہ فیصلہ عربوں نے یکسر مسترد کر دیا اور اس طرح ان کی بغاوت میں شدت پیدا ہوگئی۔ اگر چہ اس ''بغاوت'' کو (جسے عرب ''تحریک آزادی'' کہتے تھے) سختی سے دبا دیا گیا مگر اس سے عالمی سطح پر صورت حال بہت بگڑ گئی۔ برطانیہ نے سوچا کہ مشرقِ وسطیٰ میں عربوں کا اعتماد کھونا مناسب نہ ہوسکا، چنانچہ اس کے نتیجے میں مئی ۱۹۳۹ء کا بدنام زمانہ قرطاس ابیض شائع ہوا جس میں برطانیہ کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ فلسطین کو تقسیم کرنے کی بجائے متحدہ فلسطین کو اس شرط پر آزادی دی جائے کہ دس سال کے عرصے کے اندر فلسطین آزاد ہو سکے گا۔ اس قرطاس ابیض سے فلسطین میں یہودیوں کی مزید آمد کو ۱۵ ہزار افراد سالانہ تک محدود کر دیا گیا۔ یہ پابندی ۱۹۴۴ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد یہ سہولت عرب مقامی یہودیوں کے لیے مخصوص ہوگئی۔

عربوں کی بغاوت اور برطانوی قرطاس ابیض کے اثرات کو کئی زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے، اس سے فلسطین کی عرب اشرافیہ کی قوت کا خاتمہ ہوگیا۔ جبکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو پڑوسی ممالک کے سیاست دانوں نے پُر کیا۔ یہودیوں کے لیے یہ ایک واضح پیغام تھا چنانچہ انہوں نے یہودیوں کے غیر قانونی داخلے کی سرپرستی شروع کر دی۔ اس سے انہوں نے دو مقاصد بیک وقت حاصل کیے۔ اول یہ کہ سیاسی طور پر یہ صورت حال فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی بنیاد ثابت ہوئی اور دوم یہ کہ انہوں نے دنیا بھر کی قوتوں کی طرف سے holocaust کے واقعے کے حوالے سے اخلاقی ہمدردی سمیٹتے ہوئے بے پناہ فائدہ حاصل کیا۔ یہودیوں نے اس سے ایک سبق اور بھی سیکھا، اور وہ یہ کہ تشدد سے مطلوبہ نتائج کے علاوہ سیاسی مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

لندن میں چرچل کی مخلوط حکومت نے جنگ کے بعد کے منظرنامے میں، ایک دفعہ پھر مسئلہ فلسطین پر توجہ مرکوز کی اور اس کے لیے تقسیم کو حل قرار دے دیا۔ جبکہ فلسطین میں جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اتحادی جیتنے کو ہیں تو ۱۹۴۴ء میں یہودی تنظیموں نے برطانیہ کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیاں ایک بار پھر شروع کر دیں۔ اور اس کا انجام مشرقِ وسطیٰ میں تعینات برٹش منسٹر ریزیڈنٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے قتل کی صورت میں ہوا۔ چنانچہ اس قتل کے نتیجے میں تقسیم فلسطین کے کسی بھی تازہ منصوبے کا راستہ خود بخود بند ہو گیا اور برطانیہ کی کوئی نئی پالیسی سامنے نہیں آسکی۔

جب جنگ کے بعد کے دنوں میں برطانیہ کو صیہونی بغاوت اور دہشت گردی کا سامنا تھا، برطانوی فوج گزشتہ چھ سال کی طویل روایتی جنگ کی حالت سے تازہ تازہ باہر نکلی تھی۔ اس لیے اس کے بعض جرنیلوں کو عربوں کی بغاوت کا تجربہ تھا، تو کچھ برطانوی خلافِ بغاوت کارروائیوں کے تجربے تک محدود تھے۔ چنانچہ غیر عسکری (غیر مسلح) کارروائیاں کرنے کا رجحان ہی جاری رہا۔ مثلاً وسیع پیمانے پر رکاوٹیں کھڑی کر کے تلاشی وغیرہ تک ان کی کارروائیاں محدود رہیں۔ جنرل سر ایلن کننگھم، جو ۱۹۴۶ء کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں ہائی کمشنر رہا، نے کہا ''برطانیہ کو فلسطین میں ایک بالکل غیر معمولی صورت حال کا سامنا رہا جس میں صیہونی رضا کار جدید تر اسلحہ اور ماہرانہ گوریلا کارروائیوں کے ذریعے ایک نئے چیلنج کے طور پر سامنے آئے تاہم اس پر واضح اتفاق نہ ہو سکا کہ اس صیہونی سرگرمی کو خلافِ بغاوت مہم میں کہاں فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ماحول کے مطابق متواتر اور سریع کوششوں کی ضرورت تھی۔ اور اگر امیگریشن ہی کو فلسطین کے مسئلے کی اصل بنیاد سمجھ لیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ برطانیہ نے مزید سبق سیکھتے ہوئے بغاوت کے اصل المیے کا ادراک کیا کہ اگر وہ بغاوت کے اس قضیے کے موثر حل کی کوشش میں ہیں تو اس میں یہودیوں کی زیادہ سے زیادہ آبادکاری موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے صیہونی باغیوں کے مقابلے میں دوسرے گروہ یعنی عربوں کو متحرک کرنا شروع کر دیا۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد مسئلے کی کیفیت

برطانیہ کی نئی لیبر پارٹی کی حکومت کے لیے ایک بڑی مشکل اس پالیسی بیان کی صورت میں تھی جس میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر صیہونیوں (یہودیوں) کو رعایت دینے کا ذکر کیا گیا تھا جو بعد از جنگ بین الاقوامی تصفیوں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اور اس کا حل یہ سوچا گیا کہ عربوں کو خطے سے باہر آباد ہونے کی ترغیب دی جائے اور جیسے جیسے عرب اس خطے سے ہجرت کرتے جائیں یہودیوں کو ان کی جگہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بسایا جاتا رہے۔ اس طرح یہودی ریاست کے قیام کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی۔

اس وقت (۱۹۴۵ء) کی برطانوی لیبر حکومت کے نزدیک مسئلۂ فلسطین کو ایک ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی کیونکہ حکومت کو جنگ کے بعد کے ماحول میں جنگ کی تباہ کاریوں سے چھٹکارے اور یورپ کی متعلقہ تعمیرِ نو، سلطنت برطانیہ کے دفاع، سرد جنگ میں سے ابھرتی ہوئی سوویت یونین کے خلاف پالیسی کی احتیاجات، اور برطانیہ کی خودمختاری کی حمایت میں اندرون برطانیہ معاشرتی انقلاب کی جانب پوری توجہ سے ملتفت ہونا پڑا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں ہونے والی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود ایک عظیم مملکت اور طاقتور ریاست کا مقام قائم رکھنے کے لیے برطانویوں کے ارادے متزلزل نہیں ہوئے۔ مشرق وسطیٰ میں قائم برطانوی غیر رسمی سلطنت کی بنیاد چند معاہدات اور جنگی ہوائی اڈوں کے باعث تھی۔ اور برطانیہ کو اس کا اعتراف تھا کہ اس خطے میں برطانوی سیاسی، معاشی اور تزویراتی مفادات کا تحفظ عربوں کی خوشنودی سے مشروط رہے گا۔ چنانچہ برطانیہ نے سیاسی طور پر اس خطے میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے برطانیہ نواز عرب ریاستوں کے ساتھ تعاون کو وسعت دینے کی متبادل راہ اختیار کی۔ لہٰذا اس نے مصر، عراق اور اُردن کے ساتھ معاہدوں کی تجدید کی اور مصر کی قیادت میں قائم عرب قوم پرستی کی زبردست حمایت اور نمائندگی شروع کر دی۔ تاہم اس قوم پرستی نے ایک ایسے خطرے کی صورت اختیار کر لی جو خود اپنے تدوین کار کے خلاف کبھی بھی اٹھ کھڑی ہو سکتی تھی۔ یعنی ۱۹۴۵ء میں برطانیہ کی شہ پر قائم ہونے والی عرب لیگ سے برطانیہ کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ اگرچہ سوویت یونین بظاہر پس پردہ رہی مگر عربوں پر برطانیہ کی بلاشرکتِ غیرے گرفت کے خلاف سب سے بڑے چیلنج کی حیثیت سے ہر وقت سامنے رہی۔ ایران میں سوویت یونین کی موجودگی پر اصرار اور تُرکی کی درخواست پر اس کی طرف سے فوجی امداد پر آمادگی سے یہ خطرہ بہت بڑھ گیا کہ برطانیہ کے یہاں سے انخلا کی صورت میں یہ خلا سوویت یونین ہی پُر کرے گا۔ چونکہ برطانیہ خود کو نئی قائم شدہ اقوام متحدہ کی تنظیم کا بانی سمجھتا تھا، اس لیے بھی برطانوی اجتماعی دفاع کے تصور کے زبردست حامی تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگ کے بعد کی برطانوی حکومت کو اپنے مقاصد کی بجا آوری کے لیے، اس امر کا بخوبی احساس اور ادراک تھا کہ اسے سفارت کاری، معاشی اور عسکری مقاصد کے حصول کے لیے، مطلوبہ معلومات کی بنیاد پر کوشش کرنا ہوگی۔ حکومت کی طرف سے جاری یہ بیان قابل توجہ ہے:

''حکومت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے متنوع ذرائع استعمال کرنے کی تگ ودو میں ہے جن میں عسکری قوت کا استعمال، سفارتی نمائندگی، بین الاقوامی مذاکرات میں بھرپور شرکت اور عالمی تنظیموں میں شمولیت شامل ہیں۔ ان سرگرمیوں کی حمایت میں پبلسٹی کا انتہائی اہم کردار ہے اور اگر ہماری جدوجہد کو کامیاب ہونا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ ان تنظیموں سے علیحدگی کی بجائے ان کی معاونت کو زیادہ بامعنی بنایا جائے۔ زبانی جمع خرچ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے عملی کارروائیوں کی ضرورت ہوتی ہے، مگر جب الفاظ بھی عملی اقدامات کی معاونت میں ہوں تو ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں''۔

برطانیہ نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء کے درمیان فلسطین کے حوالے سے ایک طویل المیعاد پالیسی منضبط کی، جس سے مشرق وسطیٰ میں اس کے سیاسی، معاشی اور تذویراتی مفادات کا تحفظ ہوسکتا تھا جبکہ یہاں کے مستقبل سے متعلق پیدا ہونے والے روزمرہ سوالات سے بھی نمٹنا ممکن تھا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں آزاد فلسطین کے حوالے سے ایک متفقہ منصوبہ سامنے آیا جس کے مطابق فلسطین کو ایک واحد ریاست کے طور پر آزاد ہونا تھا بشرطیکہ وہاں برطانیہ کو فوجی (اڈوں کی صورت میں) مراعات حاصل رہیں اور عرب ریاستوں کی خوشنودی برطانیہ کو میسر رہے کہ اسی پر فلسطین کی بقا کا دارومدار ہوگا اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ فلسطین کی آزادی کا کوئی واضح پلان سامنے نہیں آیا جو برطانوی حکمت عملی کی کامیابی کی کوئی ضمانت فراہم کرتا، بلکہ اس میں یہ شرط بھی موجود تھی کہ منصوبے پر عمل درآمد صرف عربوں، برطانیہ اور فلسطینی یہودیوں کی رضامندی سے مشروط نہ تھا بلکہ اس کے لیے امریکہ اور مشرق وسطیٰ کی دیگر ریاستوں سے بھی منظوری لینا ضروری قرار دیا گیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہری طور پر یہ ایک غیر فطری اور نا قابلِ عمل منصوبہ تھا، مگر خطے میں برطانوی مفادات کو سامنے رکھ کر سوچیں تو اس میں حیرت کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔ اس پالیسی کی کامیابی کی مختلف کوششوں کو یکجا کر کے اس کی مجموعی کامیابی کے لیے دو کلیدی محکموں کو خدمت سرانجام دینا تھی۔ یہ محکمے خارجہ اور کالونیوں کے تھے۔ یہ گویا ایک پروپیگنڈہ مہم تھی جسے ملک کے اندر اور باہر فلسطین سے متعلق موصولہ معلومات کو ریکارڈ کرنے پر محمول کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ ارنیسٹ بیون نے پروپیگنڈے کو پہلے ہی سفارتی ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا:

"ہمیں خصوصاً موجودہ معاملات کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر نازک ترین ذمہ داریوں اور پبلسٹی کو اس انداز میں پالیسی کے ساتھ ساتھ رکھنا ہے کہ خود خارجہ سیکرٹری بھی انفارمیشن پالیسی اور اس کے اطلاق سے متعلق اپنی ذمہ داریاں کسی دوسرے کو منتقل کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو"۔ جب حکومت نے دوسری جنگ عظیم کے بعد انفارمیشن سروس کے مستقبل پر دوبارہ غور کیا تو بیون نے پروپیگنڈہ کی ذمہ داری وزارت اطلاعات سے لے کر دوبارہ وزارتِ خارجہ کے سپرد کر دی، مگر جنگ کے بعد کی برطانوی پبلسٹی ایک طرح کا سمجھوتہ ہی ثابت ہوئی۔ اگرچہ وزارت خارجہ بیرون ملک پبلسٹی کا مکمل کنٹرول نہ سنبھال سکی تاہم مرکزی محکمہ برائے اطلاعات نے دیگر وزارتوں اور شعبوں کے ساتھ تعاون اور مشاورت کا رول کامیابی سے ادا کیا۔ تاہم مختلف شعبوں نے انفرادی طور پر پالیسی معاملات کو اولیت دیتے ہوئے اپنے اپنے انفارمیشن سٹاف کو باقی رکھا۔ البتہ یہ سب کچھ ذرا کم درجے پر ہوا۔

اس حوالے سے یہ نوآبادیات کے محکمے کی ذمہ داری تھی کہ فلسطین سے متعلق برطانیہ کے اندر فلسطین کے اندرونی علاقے میں مصروف پبلک انفارمیشن آفس سے متعلق پبلسٹی کا کام کرے۔ بین الاقوامی پہلو سے متعلق تو برطانوی دفتر خارجہ نے قیادت کی اور اس کے لیے انہوں نے اپنے نیوز ڈیپارٹمنٹ، انفارمیشن سروس اور سفارت خانوں کے پریس اتاشیوں کو استعمال کیا۔ برطانوی ریاست کے دو اہم شعبوں کے درمیان فلسطین سے متعلق پالیسی کے حوالے سے مطابقت کے نتیجے میں دونوں کے ضرورت سے زیادہ پروپیگنڈے سے مختلف متعلقہ گروہوں اور ترجیحات کے حوالے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تناؤ پیدا ہونا فطری امر تھا اور اس صورت حال سے نمٹنا بھی اہم ترین ضرورت تھی۔ انفارمیشن مہم کے عین وقت پر شروع کرنے کے حوالے سے بھی اختلافات سامنے آئے۔ وقت کی تاکید کی ضرورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اس مہم میں ملوث تمام متعلقین سفارت کاری کے میدان میں ہونے والی پراگریس سے آگاہ ہوسکیں اور مطلوبہ ردعمل بھی ظاہر کرسکیں۔ اس عرصے کے دوران فلسطین کے متعلق مسلسل پروپیگنڈے کے حوالے سے حتمی تزویراتی سمت کے بارے میں برطانوی کابینہ میں غور وخوض ہوتا رہا جہاں پالیسی کے اندازِ پیشکش کے پہلو سے متعلق بحث جاری رہی جس کے تزویراتی تقاضوں کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اور اس بحث میں زیادہ تر دفتر خارجہ کا نقطہ نظر چھایا رہا جسے بیون نے پیش کیا تھا۔

اس سے برطانیہ کے اندر کی عوامی رائے کو بھی قائل کرنا مطلوب تھا تاکہ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے حکومت کی کوششوں کی مخالفت نہ کرسکے، مگر برطانوی پراپیگنڈے کے اصل مخاطب بیرون ملک کی رائے عامہ تھی۔ فلسطین میں برطانوی پالیسی سے بیک وقت عربوں، یہودیوں اور امریکہ کا متفق ہونا ضروری تھا۔ گویا پروپیگنڈے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے ان تینوں فریقوں کو قائل کیا جاسکے کہ وہ اپنی بات پر اڑے رہنے کے بجائے مشترکہ مقاصد کے لیے سمجھوتہ کریں۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو پروپیگنڈے کا مقصد یہ قرار پایا کہ انگریزوں اور امریکیوں کے مابین نقصان کو محدود رکھنے کے عمل کے ذریعے دوستی کو پروان چڑھانا ممکن بنایا جائے۔ لہٰذا فلسطین کی سرزمین پر خلاف بغاوت کارروائی محض سیکورٹی فورس کی کارروائی تک محدود رہی تاکہ اس وقت تک معاملات کو بگڑنے سے روکے رکھا جاسکے جب تک کہ کوئی عملی معاہدہ مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوتا۔

جیسا کہ برطانوی دفتر خارجہ کے اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری آئیوون کرک پیٹرک نے اعتراف کیا تھا کہ پروپیگنڈہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس کا ربط پالیسی سے نہ ہو"۔

لہٰذا یہ طے ہے کہ پروپیگنڈے کے متعلق تحقیق گویا پالیسی سے متعلق تحقیق ہوگی۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک فلسطین برطانیہ کے لیے کثیر الجہت مسئلہ بنا رہا۔ اس مسئلے کا حل محض خلافِ بغاوت مہم اور دلوں اور ذہنوں کو جیتنے والے پروپیگنڈے ہی سے ممکن نہ تھا کیونکہ پالیسی میں کئی بین الاقوامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیچیدگیاں تھیں جن سے منسلک کئی تزویراتی مقاصد تھے اور اس لیے مہم اور پالیسی میں ایک قابل فہم توازن پیدا کرنا لازم تھا۔

فلسطین۔ کئی ملکوں تک پھیلی بغاوت

برطانیہ کی طرف سے برما اور کینیا میں چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں روبہ عمل لائی گئی خلاف بغاوت کارروائیوں کے مقابلے میں فلسطین کی بغاوت قطعی مختلف تھی۔ اس امتیاز کی ایک اہم وجہ نازیوں کے یہودیوں پر مظالم اور ''ہالوکاسٹ'' کا واقعہ بھی تھا۔ اس سے فلسطین کی صورت حال خاصی متاثر ہوئی کیونکہ اس میں یہ پہلو بھی شامل ہوگیا کہ یورپ میں موجود یہودی مہاجرین کے کیمپوں کو کیسے ختم کیا جائے اور دنیا میں ابھرنے والے اس تاثر کو انہیں فلسطین میں داخلے کی اجازت دے کر کمزور کیا جائے۔ جس کے مطابق دنیا یہودیوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے علاوہ انہیں مشکوک نظروں سے بھی دیکھنے لگی تھی۔ اس کا خلافِ بغاوت مہم پر بھی براہ راست اثر مرتب ہوا کیونکہ اس کے جواز کے خلاف صیہونی پروپیگنڈہ اثر دکھانے لگا تھا کیونکہ برطانیہ کے بارے میں یہ تاثر زیادہ مضبوط ہوتا جارہا تھا کہ ہٹلر نے ''ہولوکاسٹ'' کی صورت میں اپنی انتہائی ظالمانہ کارروائی کو جہاں چھوڑا تھا، برطانیہ نے اسے وہاں سے آگے چلانے کی کارروائیاں جاری کر رکھی ہیں۔

فلسطین کی بغاوت برطانوی قبضے کے خلاف بغاوت کی دیگر مثالوں سے اس لیے بھی مختلف ثابت ہو رہی تھی کہ اس میں کئی ملکوں کے جذبات شامل ہوگئے تھے۔ مثلاً اگرچہ سوویت یونین برطانوی خلافِ بغاوت مہم کے حوالے سے براہ راست مخاطب نہ تھا مگر مشرقِ وسطیٰ میں برطانوی اقتدار کے لیے اس کا خطرہ پوری شدت سے موجود تھا۔ اسی طرح فلسطین میں امریکہ کا عمومی رویہ انسانی ہمدردی کا تھا جس کے لیے اس نے مغرب کے مفادات کے تحفظ کے لیے برطانیہ کی معاونت بھی کی مگر امریکی صدور اس امر کو کبھی نظرانداز نہیں کر پائے کہ ان کے اپنے ملک میں یہودی ووٹ ہمیشہ فیصلہ کن رول ادا کرتا رہا ہے۔ اس سارے مسئلے میں امریکہ کے اہم کردار کا اظہار معروف صیہونی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائد ڈیوڈ بن گوریان نے آئرش امریکیوں کی تحریک کے ذریعے امریکی رائے عامہ جیت کر آخرکار آئرلینڈ کو آزاد کرانے کے حوالے سے کیا اور توقع ظاہر کی کہ اسی طرز پر امریکہ میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے، آخر اسرائیل کو آزاد کرا ہی لیں گے۔ اس ضمن میں امریکی یہودیوں کے ووٹ کا فیصلہ کن کردار ایک اہم ہتھیار ثابت ہوگا۔

فلسطین یا یہودی ممکنہ ریاست کے لیے غیر فلسطینی موثر افراد کا کردار کینیا اور ملایا کی مثالوں سے قطعی مختلف رہا کیونکہ ان دونوں ممالک کی تحریک آزادی محض نو آبادی کی حد تک تھی۔ فلسطین کے آخری چیف سیکرٹری سر ہنری گرے کے خیال میں ان کی ساری نو آبادیات میں کوئی ایک آبادی بھی ایسی نہ تھی جسے آزادی کی (بغاوت کی) جدوجہد میں سرمائے، اخلاقی مدد اور سیاسی راہنمائی کے حوالے سے بیرونی امداد میسر رہی ہو۔ ان علاقوں میں ایسے حالات بھی نہیں تھے کہ وہاں خلاف بغاوت مہم کی ضرورت کو جواز حاصل ہو سکے۔ فلسطین میں مسئلے کے حل جیسی کوئی خوشخبری ممکن نہ تھی۔ ایک تو یہاں ایسا سیاسی حل ممکن نہ تھا جس سے سارے فریق مطمئن ہو سکتے۔ اس کے علاوہ غیر فلسطینی ایکٹروں نے بھی یہاں اہم کردار ادا کیا۔ کینیا اور ملایا میں برطانوی حکومت کے پاس وفاقی سیاسی تسلّط دستیاب تھا جس سے نو آبادیوں کی اکثریت نے اتفاق کیا۔

اطلاعاتی مہم کے طے شدہ مخاطبین

برطانیہ کی قائل کرنے والی اس مہم کے مخاطبین کون تھے؟ کیا ان کی صحیح صحیح نشان دہی ہو سکتی تھی؟ یہ کس لحاظ سے اہم تھے اور کس قدر فیصلہ کن ثابت ہو سکتے تھے؟

عربوں کی رائے

اس پراپیگنڈے کے اولین مخاطبین عرب ریاستیں تھیں۔ برطانیہ کو اس کا پورا یقین تھا کہ مشرقِ وسطیٰ میں اس کے تمام سیاسی و معاشی مفادات کے تحفظ کا دارومدار عرب ریاستوں کی خوشنودی پر تھا۔ اس لیے برطانوی لیبر پارٹی کی پالیسی کا لب لباب مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں عوامی فلاح و بہبود کے پروگراموں کو مقبول بنانا تھا۔ مگر برطانیہ معاشی مشکلات کے باعث بار بار کے دعووں کے باوجود کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاص کارروائی کرنے میں ناکام رہا۔ اس لحاظ سے برطانیہ کو ان متامل عرب ریاستوں کو قائل کرنے کی اپنی صلاحیت پر انحصار کرنا تھا جو برطانوی اور عرب مفادات میں مطابقت کے حوالے سے مشکوک تھیں۔ اسی حوالے سے برطانیہ کو تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے عرب نیشنلزم کا بھی سامنا تھا۔ مثلاً جب برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مصر میں قائم اپنے ہوائی اڈوں سے دستبردار ہو جائے تو یہ بات گویا واضح ہو گئی کہ اب فلسطین کے مسئلے کا حل محض برطانیہ کے بس کا روگ نہیں رہا۔ کیونکہ اب عرب ریاستیں اس پوزیشن میں تھیں کہ وہ فلسطین کے ذریعے اندرونی عرب مفادات کے تحفظ میں کردار ادا کر سکیں۔ فلسطین میں برطانوی مفادات کے لیے ایک بڑا چیلنج یہ بھی تھا کہ عرب راہنما اب اس تاثر کو ختم کرنے کے درپے تھے کہ وہ برطانیہ کے مفادات پر اپنے مفادات قربان کرتے چلے آئے ہیں (اور اب اس کا خاتمہ ہونا چاہیے) اپنی ذاتی حیثیت میں وہ اس سے متفق تھے کہ یہودیوں کے مطالبات کو (کسی نہ کسی حد تک) ملحوظ رکھا جانا چاہیے مگر اس میں چیلنج کی بات یہ تھی کہ برطانیہ عرب قائدین کو یہ باور کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھا (یا ان قائدین کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا) کہ ان کی ذاتی رائے کو عرب عوام کی رائے میں بدل کر کسی عرب۔یہودی سمجھوتے کی راہ ہموار کی جائے۔ فلسطینی عربوں کی کوئی الگ اور آزاد رائے کی اہمیت کو خارج از امکان قرار دے کر اسے عمومی عرب خوشنودی میں شامل تصور کیا جا رہا تھا۔ ان حالات میں کہ اس وقت خطے میں برطانیہ کے تزویراتی مفادات کافی وسیع تھے، فلسطین کو عرب حمایت کا محتاج رکھتے ہوئے عالمی سطح پر مسئلے کے حل میں عرب ریاستوں کے کردار اور عمومی رائے عامہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہ تھا۔

یہودیوں کی رائے

فلسطین سے متعلق لیگ آف نیشنز کی طرف سے دیے گئے اختیارات کے مطابق یہودیوں کی ایجنسی گویا ایک ایسی سرکاری تنظیم تھی جس کا کام فلسطین کی انتظامیہ کو معاشی، معاشرتی اور ایسے دیگر معاملات میں مشاورت اور معاونت مہیا کرنا تھی جس سے ایک یہودی وطن کے قیام اور فلسطین میں یہودیوں کے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔ برطانیہ کے پریس نے اس وقت یہودیوں کے مسئلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بہت تھوڑی جگہ اس مسئلے کو اخبارات میں مل سکی اس سے یہودی-عرب شدید اختلافات کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی حالانکہ اس وقت برطانوی عوام کو اس مسئلے کے خون آشام ہونے کا ذرا سا بھی ادراک ہو جاتا تو وہ کوئی بھی حل قبول کرنے کو تیار ہو جاتے۔ بلکہ برطانوی پریس، عوام اور پارلیمنٹ نے اس بات پر بے حد زور دیا کہ اگر مسئلے کا کوئی معقول حل نظر نہیں آتا یا بغاوت کے چیلنج سے نمٹنا مشکل نظر آئے تو برطانوی فوجوں کو فوری اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔

امریکی رائے

جہاں تک برطانوی تزویراتی اطلاعاتی مہم کا تعلق ہے، امریکہ اس کا اہم ترین مخاطب تھا۔ بلکہ یہ برطانیہ اور متعین شدہ یہودی نمائندوں کے درمیان ایک موثر پاور بروکر بھی تھا، کیونکہ امریکی اس وقت پوری طرح اس پوزیشن میں تھے کہ چاہیں تو صیہونیوں کی معاونت کر کے ان کے مفادات کا تحفظ کریں یا انہیں قابو میں رکھیں۔ برطانیہ نے امریکہ پر صیہونیوں کو معاہدے کی طرف آنے پر قائل کرنے کے لیے اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لیے کافی دباؤ ڈالا تا کہ مسئلے کی شدت میں کمی آئے اور فلسطین میں یہودیوں کی غیر قانونی آمد کو روکا جا سکے اور آخر کار کوئی سیاسی سمجھوتہ ممکن ہو پائے۔ مگر جلد ہی برطانیہ کو احساس ہو گیا کہ ایسا کرنا خود امریکی پالیسی کے لیے تباہ کن ہو گا اور خود برطانیہ کو مختصر مدت کے لیے سہی مگر امریکی امداد کی ضرورت تھی۔ اس لیے صدر ہیری ایس ٹرومین کے مستقبل کے فلسطین میں مفادات کا تقاضا تھا کہ برطانیہ امریکہ کی مداخلت کی اہمیت کا ادراک کرے چنانچہ دونوں مملکتوں (امریکہ و برطانیہ) کے تعلقات بعد از جنگ قرضوں وغیرہ کے حوالے سے کافی کشیدگی سے دوچار ہو گئے۔

تزویراتی اطلاعات کی مہم کے مراحل

تزویراتی اطلاعات کی مہم کو چار مدارج میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ مدارج مختلف عوامل پر مبنی ہیں جن میں اہم ترین ایکٹر، متعلقہ مخاطب گروہوں یا ریاستوں کے حوالے سے سفارتی و اطلاعاتی مہم کے علاوہ یہ امر بھی تھا کہ برطانوی پالیسی متبادلات کس طرح دوسرے میدانوں کی طرف منتقل یا محدود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے۔ ان میں سے پہلا درجہ امریکہ کی مداخلت کا ہے جو اگست ۱۹۴۵ء سے اکتوبر ۱۹۴۶ء کے درمیان رہا۔ دوسرا عرب کردار کا ہے جس کا دورانیہ اکتوبر ۱۹۴۶ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک ہے۔ تیسرا مرحلہ بین الاقوامی مداخلت ہے جو فروری ۱۹۴۷ء سے نومبر ۱۹۴۷ء تک رہا جبکہ چوتھا مرحلہ دوسرا عرب مرحلہ ہے جس کا دورانیہ نومبر ۱۹۴۷ء سے مئی ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔

امریکی مرحلہ۔ اگست ۱۹۴۵-اکتوبر ۱۹۴۶ء

اس پہلے مرحلے میں برطانیہ نے امریکی صدر ٹرومین کے موقف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسا امریکی برطانوی مشترکہ طریق کار وضع کرنے کی کوشش کی جس سے فلسطین کے مستقبل کا تعین ممکن ہوسکتا ہو۔ ٹرومین نے ایک ایسی رپورٹ کی منظوری دی جس کے مطابق یورپ میں قائم مہاجرین کے کیمپوں میں حالاتِ حیات کا ذکر تھا۔ اسی میں یہودی کیمپوں کا ذکر بھی تھا۔ چنانچہ صدر نے برطانیہ کی حکومت میں ایک ایسی لابی قائم کر دی جس کی مدد سے ہالوکاسٹ کے نتیجے میں بے گھر ہوکر یورپی کیمپوں میں پناہ گزین یہودیوں کے ایک لاکھ افراد کو فلسطین میں آباد کرانا مطلوب تھا۔ اس کوشش کے جواب میں برطانوی خارجہ سیکرٹری ارنسٹ بیون نے تجویز پیش کی کہ امریکہ اس انکوائری کمیٹی میں اپنا نمائندہ بھیجے جو خصوصاً فلسطین کے مسئلے کے ممکن حل کی روشنی میں یورپی پناہ گزین کیمپوں سے متعلق قائم کی گئی تھی۔ اس بات کا بھی ادراک کیا گیا کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے حوالے سے امریکی اثر ورسوخ قبول کرنے کے برطانوی عمل کو عربوں میں قطعی طور پر پذیرائی حاصل نہ ہوگی جو ۱۹۳۹ء میں شائع کیے گئے برطانوی قرطاس ابیض میں طے کردہ فلسطینی آبادی میں کسی بھی طرح کے اضافے کے مخالف تھے۔ بیون نے دراصل اس کوشش کے ذریعے ایک جوا کھیلا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ اگر اس شرط پر بھی فلسطین کے مسئلے کا کوئی مستقل حل نکل سکے تو عربوں کا ردعمل اپنی شدت کھو بیٹھے گا (کیونکہ عرب بھی دل سے کوئی مستقل حل چاہتے تھے)۔

اس مرحلے پر انفارمیشن کی مہم کے مندرجات میں عرب ریاستوں سے یہ اپیل بھی کی گئی تھی کہ وہ پوری طرح مذکورہ بالا انکوائری میں مکمل تعاون کا مظاہرہ کریں اور اس امر کی اہمیت کو سمجھیں کہ آخرکار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکی نقطۂ نظر خالص صیہونی نقطۂ نظر سے تو مختلف ہی ہوگا اور اس امیگریشن کے مسئلے کے حوالے سے، اس صورت میں، امریکی رائے عامہ کو متاثر کیا جا سکے گا۔ چنانچہ امریکہ میں ایسی پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی جس سے امریکیوں کو یہ باور کرانا مطلوب تھا کہ یورپ کے لیے بے گھر یہودیوں کی آبادکاری لاکھ انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہو اس کے لیے اور اقوام متحدہ کے تحت انسانی ہمدردی کا حل ضرور نکالا جائے۔ مگر فلسطین اس کا اکلوتا حل نہیں تھا۔ پبلسٹی میں یہ موقف بھی اختیار کیا گیا تھا کہ یہودی سیاسی سے زیادہ ایک مذہبی گروہ ہے اس لیے حق خود اختیاری کے لیے ان کے مطالبے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا کوئی جرم نہیں۔ اسی دوران فلسطین میں پراپیگنڈہ جاری رکھا گیا تا کہ رائے عامہ کو شدت اختیار کرنے سے باز رکھا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکی، برطانوی مشترکہ نقطۂ نظر پر زور دیا جاتا رہا۔

انکوائری کمیٹی نے اپنی رپورٹ مئی ۱۹۴۶ء میں پیش کر دی۔ اس کی دو سفارشات بہت اہم تھیں۔ ایک یہ کہ فلسطین کو ایک دوقومی (یہودی اور مسلم عرب) ریاست کے طور پر آزادی دی جائے جو ایک طرح سے یہودیوں کی شکست تھی کیونکہ وہ اسے یہودی ریاست کے طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ جبکہ دوسری سفارش میں یورپی کیمپوں میں مقیم ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سفارش عربوں کی شکست کے مترادف تھی کیونکہ وہ مزید یہودی آبادی کی آبادکاری کے خلاف تھے (تا کہ یہودیوں کو ریاست میں اکثریت حاصل ہونے سے اقتدار پر ان کی گرفت مضبوط نہ ہو پائے)۔

بدقسمتی سے برطانویوں کے لیے یہ دونوں سفارشات شکست کی علامت تھیں۔ برطانیہ کی اصل شکست فلسطین میں ان کے پروپیگنڈے کی ناکامی تھی کیونکہ جیسے جیسے پروپیگنڈے میں شدت آتی گئی، وہاں تشدد اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں ایک بم دھماکے میں ۹۱ افراد ہلاک ہو گئے۔ فلسطین میں متعین جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل سر ایولن بیکر نے روایتی پنچایتی نظام کے خلاف حکم نامہ جاری کر دیا اور فوجیوں کو اختیار دے دیا گیا کہ ایسی کارروائیوں میں ملوث یہودیوں کو غیر معمولی سزائیں دی جائیں۔ ان کی خصوصی آبادیوں پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھاپے مارنے پڑیں تو اجتناب نہ کیا جائے۔ اس امر کی بھی پوری دنیا میں بھرپور پبلسٹی ہوئی جس سے کوئی خوش کن صورت پیدا نہ ہوئی۔

اگرچہ مذکورہ رپورٹ کو عربوں اور یہودیوں، دونوں نے رد کر دیا تھا مگر برطانوی اب بھی اس کوشش میں تھے کہ اس کے اطلاق کے سلسلے میں درکار فوجی اور معاشی دباؤ سے نمٹنے کے لیے امریکہ کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اس منصوبے کو موریسن-گریڈی منصوبے کا نام دیا گیا۔ بہرطور ٹرومین نے صوبائی خودمختاری کے برطانوی منصوبے کی حمایت سے انکار کر دیا اور خفیہ طور پر فلسطین کے ایک معقول خطے میں خودمختار یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔

چنانچہ پہلا مرحلہ برطانیہ کی امریکی تعاون کے حصول کی کوششوں کی ناکامی پر اختتام پذیر ہوا۔ اس کے نتیجے میں برطانوی پروپیگنڈے کو دفاعی شکل اختیار کرنا پڑی۔ اس لحاظ سے برطانوی حکومت کی پوزیشن کافی خراب ہوگئی کیونکہ ایک طرف تو اس نے عربوں کی خوشنودی کھودی تھی مگر ایسا کرتے ہوئے یہودیوں کی خوشنودی کے لیے بھی کچھ نہ کیا تھا۔ لہٰذا دونوں کے ساتھ اس کے مراسم ماند پڑ گئے۔

۲-عربوں کا مرحلہ-اکتوبر ۱۹۴۶-فروری ۱۹۴۷ء

انفارمیشن مہم کے دوسرے مرحلے میں پبلسٹی کے ذریعے ایک اور حل کی برطانوی کوششوں میں زور پیدا کیا گیا۔ چنانچہ لندن میں ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس بلائی گئی جس میں عرب ریاستوں اور یہودی ایجنسی کے نمائندوں کو دعوت دی گئی جہاں انکوائری کمیٹی کے مندرجات پر بار دیگر غور کیا گیا۔ تزویراتی اطلاعاتی مہم کے اس مرحلے پر پروپیگنڈے کے بین السطور مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عرب ریاستوں کو مشرق وسطیٰ میں عرب-برطانیہ تعلقات کی افادیت کا قائل کیا جائے اور انہیں اس پر راغب کیا جائے کہ وہ خفیہ طور پر برطانوی پالیسی سے متفق ہونے کے ساتھ ساتھ مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے تجاویز بھی دیں۔ انہیں اس سے یہ باور کرانا بھی مطلوب تھا کہ اس طرح وہ اپنے عوام کو کھلم کھلا کہہ سکیں گے کہ انہوں نے کن مقاصد کے تحت معاہدے کی ضمانت کی حامی بھری ہے۔ یہودی ایجنسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی قریبی رابطہ ہوا اور انہیں لندن کانفرنس میں دلجمعی سے شرکت کرنے کی دعوت دی گئی تھی اور ان سے کہا گیا کہ وہ پیشگی شرائط کے بغیر کانفرنس میں شرکت کریں اور یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ہالوکاسٹ سے بچ رہنے والے یورپی یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کی سفارش کی تائید کرے گی۔ بشرطیکہ یہودی دوقومی ریاست کے قیام کی حامی بھرلیں۔ امریکہ سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ یہودیوں کو اس مصالحتی معاہدے کو تسلیم کرنے کے لیے قائل کرے۔

قائل کرنے کی یہ ساری کوششیں اس لیے ناکام ہوگئیں کہ عرب راہنما اس معاہدے کی حمایت علی الاعلان کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اور وہ فلسطین میں مزید کسی یہودی کی آبادکاری کے حق میں بھی نہ تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مشرق وسطیٰ میں عرب رائے عامہ سخت سے سخت ہوتی گئی اور اس کے پیچھے مصر کا برطانیہ کے لیے ایک چیلنج تھا جس کی بنیاد مصر کا یہ مطالبہ تھا کہ ۱۹۳۶ء میں طے پانے والے معاہدے پر نئے سرے سے گفت وشنید کی جائے۔

اس امر سے پردہ اٹھ گیا کہ برطانوی امریکیوں کی رائے کو اپنے حق میں کرنے میں ناکام رہے ہیں اور متعلقہ انفارمیشن اداکار برطانیہ کے قابو میں نہیں آ سکے۔ برطانیہ کی طرف سے لندن کانفرنس کے نتیجے میں مسئلہ فلسطین کا سفارتی حل تلاش کرنے کی کوشش اس وقت دم توڑ گئی جب کانفرنس سے قبل ہی یعنی نومبر میں یہودیوں سے صدارتی انتخاب کے دوران ووٹ کی اپیل کر دی گئی۔ ۴ اکتوبر کو جو یہودی کیلنڈر میں ایک انتہائی مقدس تاریخ ہے، صدر ٹرومین نے فلسطین کے ایک معقول رقبے پر آزاد اور مستقل یہودی ریاست کی حمایت کا کھلے عام اعلان کر دیا۔ اب یہودی ایجنسی کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ کھلم کھلا اعلان حمایت کے باوجود کسی ایسے معاہدے میں شریک ہو جس میں آزاد یہودی ریاست کا ذکر نہ ہو۔ جبکہ انہیں یہ یقین بھی ہوا کہ امریکہ آزاد یہودی ریاست کے قیام کے عمل میں ہر طرح کی مدد بھی فراہم کرے گا۔

۳۔ بین الاقوامی مرحلہ: فروری تا نومبر ۱۹۴۷ء

انفارمیشن مہم کا تیسرا یعنی فروری سے نومبر ۱۹۴۷ء تک کا بین الاقوامی مرحلہ اس پراپیگنڈے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ شروع کیا گیا کہ برطانیہ فلسطین سے متعلق اپنے ریفرنس کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بغیر اضافی سفارشات کے پیش کرے گا۔ دراصل ایک متفقہ معاہدے میں ناکامی کے بعد برطانیہ کے پاس فلسطین میں مزید قیام کے لیے فی الحال کوئی متبادل موجود نہ تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسے فیصلے کی تائید کرنے کی بجائے کہ جس سے عربوں سے تعلقات خراب ہوں، کہیں بہتر ہے کہ مسئلے کو عالمی برادری کے سامنے رکھا جائے۔ اگرچہ برطانیہ کو یقین تھا کہ اقوام متحدہ میں تو دو اور دو چار کا اصول کارفرما ہے لہٰذا وہاں سے تقسیم کے فارمولے کو قبولیت نصیب نہیں ہوگی کیونکہ جنرل اسمبلی میں قرارداد کی منظوری کے لیے دو تہائی ممبروں کی حمایت کے ذریعے تزویراتی مقاصد حاصل کرنے کا ایک موقع مل سکتا تھا۔ مگر اس سے مشرق وسطیٰ میں بین الاقوامی حمایت کے ذریعے کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں فلسطین پر اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی کے نام سے ایک اور کمیٹی قائم کی گئی تاکہ وہ حالات کا تجزیہ کر کے حل تجویز کرے۔ اس موقع پر برطانیہ نے کوئی من پسند حل پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی ایک غلطی ہی تھی کیونکہ جو کچھ متفقہ طور پر سامنے آیا وہ برطانوی خواہشات کے برعکس تھا۔ دراصل برطانوی قیادت کا خیال یہ تھا کہ اس علمی کانفرنس کے اعلان ہی سے عربوں اور یہودی دونوں کے دماغ ٹھکانے آ جائیں گے اور وہ مصالحت کی نیت سے کانفرنس میں شرکت کے لیے لوٹ آئیں گے۔

انفارمیشن مہم کے اس مرحلے پر مندرجات کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ پروپیگنڈے کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو یہ تاثر دیا جائے کہ مسئلے کو اقوام متحدہ میں لانے سے برطانیہ کا حقیقی مقصد فلسطین میں اپنے اقتدار کو طول دینا نہیں بلکہ فی الواقعہ مسئلے کو عالمی دباؤ کے ذریعے حل کرنا ہے۔ الٹا اس سے عالمی سطح پر یہ تاثر ابھرا کہ کوئی قابل عمل حل سامنے نہ آنے کی صورت میں برطانیہ فلسطین سے انخلاء پر تیار ہے۔ البتہ اسی طرح یہ تاثر بھی قائم ہوا کہ برطانیہ اس پورے مسئلے میں ایک بے لوث فریق ہے اور مسئلے کے حل کے لیے اس کی بےچینی اس بنیاد پر ہے کہ اقوام متحدہ نے اسے فلسطین میں جو ذمہ داری سونپی تھی وہ ایک مفت کی تکلیف ہے جس سے برطانیہ کو سامنا ہے۔ لہٰذا برطانیہ اس پوزیشن میں نہیں کہ کسی بھی حل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو عربوں اور یہودیوں کی رضامندی کے بغیر زبردستی تھوپ دے۔ اس بات کی کوشش البتہ کی گئی کہ عالمی رائے عامہ کو اس تصفیے پر مائل کیا جاسکے کہ دہشت گردی اور غیر قانونی امیگریشن دونوں کی مذمت کی جائے۔ کیونکہ انہی کے باعث فلسطین میں بالخصوص اور مشرق وسطیٰ میں بالعموم امن داؤ پر لگا ہوا ہے۔ پروپیگنڈے میں اس امیگریشن کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش بھی کی گئی جو ایک غیر فطری تنظیم کی طرف سے یورپ میں آباد یہودیوں کو ان کی مرضی کے خلاف فلسطین میں آباد کرنے کی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ آخر میں بین الاقوامی برادری کو ان کے فیصلوں کے ممکنہ نتائج کو سمجھنے اور فیصلوں تک پہنچنے کے بعد انہیں روبہ عمل لانے میں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے پبلسٹی جاری رکھی گئی۔

اس مرحلے کے دوران برطانیہ کی انفارمیشن مہم کو ناکام کرنے کے لیے بہت سے عوامل نے متفقہ رول ادا کیا اور اس کے نتیجے میں برطانیہ کو ستمبر ۱۹۴۷ء میں فلسطین سے کوئی بامقصد معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں انخلا کا عندیہ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ برطانیہ کو فلسطین کی طرف سے غیر قانونی امیگریشن کے خلاف قرارداد مذمت تک کی منظوری میں بھی ناکامی ہوئی۔ بلکہ الٹا صیہونیوں نے برطانیہ کی اس کوشش کو، جو اس نے امیگریشن رکوانے کے لیے کی تھیں، اپنے پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا اور ممکنہ مہاجرین کے ایک بحری جہاز پریذیڈنٹ وارفیلڈ کو (جسے بعد میں ''ایگزوڈس'' کا نام دے دیا گیا تھا) پروپیگنڈہ آئٹم کے طور پر استعمال کر ڈالا۔ کوئی ۴۰۰۰ یہودی عین اس وقت فلسطین میں داخل ہوئے جب اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی برائے فلسطین (UNGCOP) اپنی تفتیش میں مصروف تھی۔ اس موقع پر جب ان ۴۰۰۰ صیہونیوں کو زبردستی واپس جرمنی بھیج دیا گیا، تو صیہونیوں نے برطانیہ کو یہودیوں کا قاتل قرار دے کر بین الاقوامی حلقوں کی ہمدردی حاصل کر لی۔ جب کہ اقوام متحدہ کی طرف سے ان کی فلسطین میں آبادی کی سفارش موجود تھی، تو یہ معاملہ برطانوی پروپیگنڈے کے لیے ایک تباہ کن دھچکا ثابت ہوا۔ اس واپسی کو نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ خود برطانیہ میں بھی ایک ناجائز سرگرمی قرار دیا گیا۔ عین اس وقت جب اپنے دو سارجنٹوں کے اغوا اور قتل کی بنیاد پر برطانیہ کو عالمی ہمدردی کی توقع تھی، صیہونیوں نے اخلاقی اور پروپیگنڈہ دونوں اعتبار سے اسے شکست فاش دے دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برطانیہ کی توقعات اور پبلسٹی کی صورت میں مسلسل کوششوں کے برعکس UNSCOP نے بھی فلسطین کی تقسیم کی سفارش کر دی۔ نومبر میں امریکہ اور سوویت یونین نے نہ صرف قرارداد (سفارش) کی حمایت کی بلکہ تقسیم فلسطین کے منصوبے کے نتیجے میں یہودی ریاست کے قیام کو بھی تسلیم کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کے اس تصور کے قیام کے عمل میں کہ اقوام متحدہ برطانوی مفادات کے خلاف فیصلہ نہ دے گی، ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بین الاقوامی برادری کے لیے تقسیم فلسطین کے نتائج کو سمجھنے کے لیے تمام تر برطانوی سرکاری تنبیہات بے اثر ثابت ہوئیں۔

۴۔ دوسرا عرب مرحلہ: نومبر ۱۹۴۷ء – مئی ۱۹۴۸ء

چوتھا جو دوسرا عرب مرحلہ بھی تھا، تقسیم فلسطین کے حق میں اقوام متحدہ کے ووٹ اور مئی ۱۹۴۸ء میں یہاں اقوام متحدہ ہی کی طرف سے عطا کردہ اختیارات کے خاتمے کے مرحلے پر محیط ہے۔ برطانیہ نے بہت واویلا کیا کہ انخلا کے حوالے سے حکومت کے بیان پر کان دھرے جائیں کیونکہ ایسے حالات میں جب فلسطین کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا ہے، انخلا آسان نہ ہوگا۔ اس موقف سے دراصل عربوں کے ساتھ افہام و تفہیم کی کیفیت برقرار رکھنے کی کوشش مراد تھی۔ دوسرے، بین المذاہب فسادات بھی انخلاء کو مشکل بنا سکتے تھے۔ چونکہ برطانیہ کی ترجیح فلسطین سے انخلا تھا اس لیے اب وہ کسی ایسے تصفیے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں اسے مزید کچھ عرصے کے لیے یہاں رکنا پڑے کیونکہ ایسی صورت میں وہ عرب سربراہوں کے سامنے اپنی پوزیشن مزید خراب کر لیتا۔ برطانیہ کو اس کا ادراک تھا کہ تقسیم کے فارمولے کی تائید کی جائے یا مخالفت دونوں صورتوں میں اس کی پوزیشن خراب ہوگی اور اسے سخت تنقید کا سامنا ہوگا۔ اسی لیے برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ وہ دنیا پر واضح کر دے کہ تقسیم فلسطین کے فیصلے کا اطلاق اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے مسلسل کوشش کے ذریعے مسئلے کو مقامی رنگ دینے اور مزید امیگریشن ختم کرنے پر زور دیا۔ برطانیہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جس کے نتیجے کے طور پر برطانیہ کو عرب ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدوں کی بنا کر عملی تقاضوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مظاہرہ کرنا پڑے اوراس کے بدلے میں امریکی اور عالمی رائے عامہ کی حمایت سے محروم ہوجائے۔

اس مرحلے کے اہم نکات میں سے ایک ایسی انفارمیشن مہم کو کامیابی سے چلانا تھا جس سے دنیا کو باور کرایا جاسکے کہ برطانیہ کا اصل مقصد غیر جانبداری ہے اور دوسرے وہ فلسطین سے انخلا کے لمحے تک امن وامان کی فضا کا خواہش مند ہے۔ اقوام متحدہ سے ملے ہوئے اختیار کے بعد کے حالات کی روشنی میں برطانوی پالیسی اسی دلیل پر قائم رہی کہ فلسطین سے انخلا کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ وہ پورے مشرقِ وسطیٰ سے لاتعلقی اختیار کررہا ہے۔ اسی لیے اس نے باہمی مفادات پر مبنی عرب۔ برطانیہ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔

جس دوران برطانیہ کی فلسطین میں امن کے قیام کی اپیل ناکام ہوئی وہیں برطانوی انخلا سے قبل کی عرب ریاستوں کی عسکری مداخلت کی روک تھام بھی ہوگئی۔ بہرطور مقبولیت اور مورال کے حوالے سے برطانیہ انتہائی زخم خوردہ ہوچکا تھا۔ جنگ عظیم دوم میں فتح حاصل کرنے کے باوجود اس کے فوراً بعد صیہونی چیلنج کے ہاتھوں شکست، بعداز جنگ برطانوی تاریخ کی سب سے بڑی توہین تھی۔ اس ناکامی کو خاص پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک خطے کے وسیع تر مفادات کا تعلق ہے، برطانیہ نے خود کو فلسطین میں یہودیوں کے مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری اور عربوں کی نظروں میں آزاد یہودی ریاست کے قیام میں معاونت کے الزام سے بچالیا۔ اس طرح سویز پر اس کا قبضہ ۱۹۵۶ء تک اور عراق میں اس کے اڈے ۱۹۵۸ء تک قائم رہے جبکہ لیبیا میں اس کی فوجیں انقلاب یعنی ۱۹۶۹ء تک موجود رہیں۔ اور مجموعی طور پر مشرق وسطیٰ میں اس کی براہ راست موجودگی ۱۹۷۰ء کی دہائی تک باقی رہی۔ برطانیہ بہرحال مسئلہ فلسطین اور جنگ عظیم کے فوراً بعد کے عرصے میں امریکہ سے تعلقات کے معاملے کو الگ الگ رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ ہی مشرق وسطیٰ کے حوالے سے اینگلوامریکن تعلقات کا ایک نیا دور آیا جب امریکہ نے خطے میں اپنی فوجی اور تزویراتی سہولیات باقی رکھنے اور جنگ کی صورت میں پھر سے آن موجود ہونے کے حق کے حصول کے لیے پوری پوری معاونت کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نتائج

تزویراتی انفارمیشن مہم کے اس تجزیے کے نتیجے میں ایک کامیاب خلافِ بغاوت کارروائی اور مہم کو روبہ عمل لانے کے بنیادی اصول کو تقویت ملتی ہے اور آج بھی اسی اصول کی معقولیت کی گواہ ہے۔ پہلا اصول تو یہ ہے کہ ایسی مہمات میں اصل زور پرامن ذرائع پر ہونا چاہیے کیونکہ جب بھی عسکری اور سیاسی قیادت کے مابین افتراق پیدا ہوا، سول ذرائع کے حصول میں کامیابی ہوئی۔ دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ ایک واضح سیاسی مقصد مدنظر رہنا چاہیے۔ برطانیہ کا یقیناً سیاسی مقصد موجود تھا جس کے مطابق برطانیہ کے فلسطین میں مفادات کا تحفظ ہوتا، امریکی برطانوی تعلقات معقول حدود میں رہتے اور مشرق وسطیٰ میں اس کی پوزیشن مستحکم رہتی۔ تاہم اگر خلافِ بغاوت مہم کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کوئی واضح سیاسی مقصد نہ تھا۔ کیونکہ تصفیہ ہوئے بغیر بغاوت کا خاتمہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ واضح سیاسی مقصد ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایسے مقاصد کی موجودگی ضروری ہے جن کے ذریعے کوئی عملی حل نکل سکے اور کچھ کارروائیاں واضح طور پر میدان عمل میں نظر آسکیں۔ بظاہر ایسا کوئی تصفیہ ممکن نظر نہیں آتا جس سے عربوں اور یہودی دونوں کی اکثریت کو مطمئن کیا جاسکتا۔ تیسری ضرورت یہ ہے کہ ایسے متنازعہ علاقے میں کم از کم منضبط حکومتی مشینری کا وجود ضروری ہے۔ فلسطین میں ایک منضبط اور باقاعدہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عسکری ردعمل تو موجود تھا جس کی پشت پر ایک لائن آف ایکشن متعین رکھنا تھا تاوقتیکہ کوئی سفارتی تصفیہ ایسے حالات پیدا کردیتا جن کے نتیجے میں بغاوت ختم ہو پاتی۔

چوتھی ضرورت خفیہ اور ظاہری معلومات کے ایک ہی پریمیم پر ہونے کی تھی۔ جہاں تک خفیہ بالخصوص انسانی معلومات کا تعلق ہے، برطانیہ کے پاس ایسا کوئی ہتھیار موجود نہ تھا اور حقیقی معنوں میں اسے ایسی کوئی انفارمیشن تحریک میسر نہیں آئی جس سے اسے زیادہ موثر صیہونی انفارمیشن کارروائیوں سے نمٹنے میں مدد مل سکتی۔ پانچویں ضرورت یہ ہے کہ باغی کو معاشرے اور کمیونٹی سے الگ کیا جائے اور اسے اس کی انفارمیشن کے ذرائع سے محروم اسی صورت میں کیا جاسکتا تھا جب اس کے لیے بہتر متبادل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذرائع دستیاب ہوں۔ فرض کیجیے اگر برطانیہ دہشت گردوں کو عام اور روادار یہودی اکثریت سے الگ کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو بھی وہ اس روادار اکثریت کو یہ باور نہ کرا سکتا کہ دہشت گردانہ کارروائیوں کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ہر یہودی خود مختاری اور امیگریشن کا حق چاہتا تھا۔

جہاں تک فلسطین میں برطانوی قیادت کے لیے موجود خصوصی معلومات کے چیلنج کا تعلق ہے حکومت کو ایک کامیاب انفارمیشن مہم کے مندرجات کی اہمیت کا احساس تھا اور اس نے ایسے مندرجات کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی مگر اس کے نتائج ملے جلے رہے۔ برطانیہ کو باغیوں کے پروپیگنڈے کے مقاصد معلوم تھے اور انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ وہ برطانیہ کی کمزوریوں سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں گویا برطانیہ کے لیے پروپیگنڈے کے مخاطبین متعین تھے سو وہ استعمال بھی کیے گئے۔ پروپیگنڈے کے موضوعات بھی برطانوی کارروائی کے جواز اور اس میں دیانت داری ثابت کرنے ہی سے متعلق تھے مگر اصل مسئلہ تزویراتی پروگرام کی بجائے ایک پالیسی کی تشکیل کا تھا۔ یعنی مقابلے کی صلاحیت کی حامل تزویراتی ترجیحات کبھی متعین نہیں کی گئیں۔ لہٰذا واحد متعین گروپ بطور مخاطبین پروپیگنڈہ تیار نہیں کیا جا سکا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میدان عمل میں روبہ عمل آنے والے واقعات کا ٹیمپو اس قدر تیز تھا کہ برطانویوں کو ان سے نمٹنے کی صلاحیت ہی میسر نہ تھی۔ خصوصاً ایسے نمٹنا کہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات سے وہی تصور حاوی رہے جو عملاً وجود میں آ رہا تھا (یعنی یہودی کسی واقعے کا غلط تاثر دینے کا پروپیگنڈہ نہ کر سکیں)۔ یہ برطانویوں کے بس میں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی انفارمیشن مہم کا انداز اکثر مدافعانہ رہا۔ وہ صرف واقعات پر ردِ عمل ہی کا مظاہرہ کرتے رہے، کبھی اپنی مرضی کا رنگ ان واقعات کو نہ دے سکے۔

ایڈم رابرٹس نے حالیہ دہشت گردانہ واقعات پر جاری بحث کی غیر تاریخی نوعیت سے متعلق واویلا کیا ہے جو بڑی حد تک (شمالی آئرلینڈ سے متعلق برطانوی کارروائیاں اس حوالے سے ایک استثناء ہیں) برطانیہ کے سابقہ تجربے کی بنیاد پر دہشت گردی اور بغاوت سے نمٹنے میں ناکام رہا ہے۔ اس لحاظ سے فلسطین کے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک کی خلافِ بغاوت کارروائی اور تزویراتی انفارمیشن مہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی لحاظ سے بڑی منفرد کارروائیاں ہیں۔ مگر ان سے بھی بعض مسائل کی نشان دہی ہوتی ہے جن کی مطابقت بعض عراقی واقعات وحالات سے کافی گہری ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہمارے سامنے اس تمام کارروائی کے نتیجے میں وجود میں آنے والی (مطلوبہ) ریاست کی نوعیت قطعی واضح ہو اور یہی صورت کامیابی سے تمام متعلقہ گروہوں تک بذریعہ پروپیگنڈہ پہنچے اور اسے میدان عمل میں ایک مہم کی شکل بھی دی جا سکے۔ ایک موثر انفارمیشن مہم کی ضرورت اس لیے ہے کہ ایک تو بیانات کا مفہوم اور لہجہ ایک سا ہو دوسرے تمام متعلقہ مخاطبین کو اس سے متاثر کیا جا سکے۔ اس کے لیے متحدہ جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ جاننا بھی بے حد ضروری ہے کہ یہ کارروائی کس گروپ یا مخاطب کے لے اہم ترین ہے اور یہ بھی کہ اس گروپ کے بارے میں ہماری معلومات کس قدر جامع ہیں۔ فلسطین میں ملوث رہنے کے حوالے سے برطانیہ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ایسی کارروائی اس وقت تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے جب دونوں یا تمام اتحادی برابر اہمیت کے حامل ہوں اور ان کے درمیان سرے سے کوئی گلہ شکوہ اور مقاصد میں افتراق موجود نہ ہو۔ آج عراق میں عالمی پبلک ڈپلومیسی اور اندرون ملک مخاطبین میں زبردست کشیدگی موجود ہے، امریکی مخاطبین سے کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ سپاہی عراق میں ان کے لیے لڑ رہے ہیں لہٰذا اندرون ملک کیسے لڑ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم دنیا کو زیادہ سے زیادہ پرامن رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں"۔

اور جب غیر ملکی رائے عامہ سے مخاطب ہونا ہو تو زور دینے کے حوالے سے الٹ الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ یہ صورت حال پیچیدہ ہو جاتی ہے جب کچھ اتحادیوں کے شانہ بشانہ لڑنا ضروری ہوا اور وہ اتحادی اپنے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کر رہے ہوں۔ اور ان کی اپنی اپنی انفارمیشن ترجیحات ہوں۔ ایسی صورت میں میڈیا اور دشمن ہماری صفوں میں موجود اس پالیسی اور عمل میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے اسے پروپیگنڈہ آئٹم بنا کر اس سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا یہ کہ اگر بغاوت بنیادی طور پر ''جواز کی جنگ'' ہو تو تزویراتی انفارمیشن مہم اسی صورت میں کامیاب ہوگی جب حکومت (اس صورت حال میں امریکہ) اپنی کارروائیوں کے جواز کو ثابت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قانون کے دائرے سے نکل جاتا ہے تو گویا وہ دشمن (باغیوں) کی تزویراتی انفارمیشن مہم (پروپیگنڈے) کو تقویت پہنچا رہا ہوتا ہے اور جتنی بار یہ حرکت دہرائی جائے عدم جواز کے تصور ہی کو تقویت ملے گی۔ آج عراق، امریکی اتحادیوں کے زعم میں خلافِ بغاوت کارروائی (COIN) کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور یہ امران کے دعوے کو تقویت پہنچاتا ہے کہ کارروائی کے آغاز ہی سے اسے عالمی رائے عامہ نے ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اس لحاظ سے ایسی رائے کو فوراً بدل دینا یا جو یقین عالمی رائے عامہ کے دلوں میں راسخ ہو چکا ہو، اسے ختم کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ تصور، رائے اور یقین میں ایسی تبدیلی اول تو ناممکن ہوتی ہے ورنہ طویل مدت کی متقاضی ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ تزویراتی انفارمیشن مہم (پروپیگنڈے) کے بارے میں متعلقہ لوگوں کی رائے پر اپنی مرضی مسلط کرنا حکومتی سرگرمیوں کے حوالے سے کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ مگر یہ خاصا پیچیدہ اور مشکل کام ہے، بلکہ ۱۹۴۵-۴۸ء کے ماحول کے مقابلے میں اب یہ اور بھی مشکل ہے کیونکہ آج میڈیا اور انفارمیشن کے ذرائع اس قدر وسیع احاطہ اثر رکھتے ہیں کہ پوری طرح سے ان پر گرفت ممکن نہیں۔ ڈونلڈ رمزفیلڈ نے ''آزادیٔ عراق'' کے حوالے سے کیے گئے آپریشن کے دوران میڈیا کو شامل رکھنے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اپنے بیان میں کہا ہے:

> ''اچھی یا بری ہمیں حقیقی صورت حال بہر صورت بیان کرنا ہے ورنہ میڈیا خواہ مخواہ اسے توڑ مروڑ کر بیان کر کے گمراہ کن تاثر پیدا کرے گا''۔

اور شاید حکمت عملی ترتیب دیتے وقت میڈیا کو آگاہ رکھنے کے پیچھے یہی خیال کارفرما رہا ہوگا تا کہ تزویراتی انفارمیشن مہم میں پیش قدمی کا تاثر ملے اور انفارمیشن میں امریکی بالادستی قائم رہے کیونکہ عراقی ''جھوٹ'' کا یہی علاج ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ انفارمیشن مہم کی مشکلات اور حدود کار کو سمجھنا ضروری ہے۔ پروپیگنڈہ پالیسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا متبادل کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ اسے عسکری قوت، معاشی صلاحیت اور مالیاتی استحکام کا متبادل قرار دیا جانا چاہیے۔ پروپیگنڈہ شاید کمزوریوں کو چھپا سکے مگر قوت کا تاثر اسی وقت قائم کیا جاسکتا ہے جب دفاعی قوت موجود ہو لہٰذا اتزویراتی انفارمیشن مہم میں عملی کارروائیوں کی شمولیت لازم ہے۔ انفارمیشن کی حکمت عملی سے آپ سفارتی اور عسکری حکمت عملی کا تحفظ ایسی صورت میں نہیں کرسکتے جب ان میں واقعی کوئی خامی یا نقص موجود ہو۔ جو لوگ امریکی ''سافٹ پاور'' کے تاثر کی وکالت کرتے ہیں، ان کی رائے میں سرد جنگ کے دور میں کی گئی کوشش جیسی گرمجوشی اس تاثر کے قیام کے لیے بھی درکار ہے۔ اس کے باوجود امریکی پالیسی کے مندرجات خواہ کتنے ہی جمہوریت پسند ہوں، اس سے حتمی کامیابی کی ضمانت حاصل نہیں ہوتی۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com